پروفیسر عنوان چشتی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

"دنیا میں اشخاص کا سیلاب ہے مگر شخصیتیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ شخص ایک فرد ہوتا ہے، مگر شخصیت ایک انجمن اور ایک تحریک ہوتی ہے اس کو ایک ادارہ اور ایک عہد بھی کہا جا سکتا ہے۔ شخص اور شخصیت میں وہی نسبت ہوتی ہے، جو قطرے اور گہر میں ہے۔ غالب نے یوں ہی نہیں کہا تھا ع " دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔"

جس طرح قطرہ تعمیر اور تطہیر کے مختلف مراحل سے گزر کر گہر بنتا ہے، اسی طرح شخص زندگی کے افق پر بار بار ڈوبتا اور ابھرتا رہتا ہے۔ اپنی خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ لمحہ لمحہ طلوع ہوتا ہے۔ زندگی کے دائرے میں ان گنت حادثوں کے درمیان جیتا اور شخصیت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اور زندگی میں جمال آفرینی اور توانائی کے ایک نئے نظام شمسی کی تشکیل کرتا ہے۔ شخصیت اپنے افتادِ مزاج، ردِعمل کے اسلوب، دائرہ کار، اثرات اور مضمرات کے نقطۂ نظر سے جتنی موثر، مفید اور متحرک ہوتی ہے، اتنی ہی پرکشش اور بڑی ہوتی ہے۔

"مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی ایک شخص نہیں بلکہ ایک شخصیت تھے۔ جنھوں نے اپنے فکر و عمل سے زندگی کے نگار خانے میں ایسی شمعیں روشن کی ہیں، جن کی روشنی دور تک اور دیر تک باقی رہے گی اور آنے والی نسلوں کو راہ دکھاتی رہے گی۔

مفتی صاحب کی شخصیت سادگی و پرکاری اور علم و عمل کا پیکر تھی۔ جنھوں نے مفتی صاحب کو دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی وضع قطع وہی تھی، جو ایک عالم کی ہوتی ہے۔ خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے علما کی ہوتی ہے۔ سر پر عام طور پر اونچی باڑھ کی ٹوپی اوڑھتے۔ کرتا اور پاجامہ پہنتے۔ اس پر شیروانی ہوتی۔ جو سادگی اور سنجیدگی کا نشان معلوم ہوتی اور ان کے بدن پر بھلی لگتی۔ چہرے پر اوسط درجہ کی مخروطی انداز کی ڈاڑھی اور بالائی لب پر ہلکی ہلکی مونچھیں؛ جو ان کے بیضوی چہرے پر اچھی لگتی تھیں۔ جوانی میں مفتی صاحب کا رنگ قدرے صاف رہا ہوگا۔ لیکن جب میں نے انھیں دیکھا تو وہ گیہواں ہو چکا تھا۔ ناک نقشہ مردانہ اور خاصا پرکشش تھا۔ کشادہ پیشانی، جس پر سجدے کا نشان چمکتا تھا۔ اوسط درجہ کی آنکھیں، جو تہذیب و شرافت کا گہوارہ معلوم ہوتی تھیں۔ ناک متوسط، جو آگے سے قدرے چوڑی تھی اور ان کے عزائم کی صلابت کو ظاہر کرتی تھی۔ کان حد اوسط سے ذرا بڑے تھے جو اُن کی طویل عمری کے ضامن تھے۔ اوسط درجہ کا قد اور بھرا بھرا بدن تھا۔ جو ان کے حوصلوں کی پختگی کی غمازی کرتا تھا۔ مجموعی طور پر مفتی صاحب کا پیکر مردانہ وجاہت کا مظہر تھا۔ مفتی صاحب بولتے تو کانوں میں رَس تو نہ گھولتے۔ مگر موتی ضرور رولتے تھے۔ ان کی آواز کا حجم اچھا خاصا تھا۔ وہ ایسے جلی اور گمبھیر سروں پر مشتمل تھی، جو خطابت کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ مجمع میں بولتے تو مخاطب کی نفسیات اور علمی استعداد کا خیال رکھتے۔ اپنی بات کو دلیل سے باوزن بناتے اور ایسا پیرایہ اختیار کرتے کہ ان کی بات دل میں اُتر جاتی۔ نجی محفلوں میں سادگی سے باتیں کرتے، مگر ان میں پُرکاری اور بلاغت ہوتی۔ مفتی صاحب اگرچہ صاف گو تھے، مگر موقع و محل کی مناسبت، مخاطب کی عمر، مرتبے اور صلاحیت کے پیشِ نظر جواب دیتے۔ جس میں علم کی روشنی اور تجربے کی تازگی ہوتی۔ مفتی صاحب بنیادی طور پر بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ مگر آخر عمر میں بہت حساس ہو گئے تھے۔ اور اسی لیے کبھی کبھی ان پر خلافِ مزاج یا غلط بات کا ردِ عمل ہوتا۔ اُن کے لہجے میں تلخی آجاتی، اور چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہو جاتے۔ مگر یہ کیفیت دیر تک باقی نہ رہتی بلکہ ان کی فطری خوش طبعی اس پر غالب آجاتی اور وہ پھر اُسی سادگی و پرکاری سے بات کرتے اور مخاطب کے دل میں گھر کر لیتے۔ اگر نقد حضرات مجھے معاف کریں تو عرض کروں کہ ان کی شخصیت کا جادو بتیر کے نشے کی طرح دھیرے

اثر کرتا؛ مگر دیر پا رہتا شراب خانہ ساز کی طرح مخاطب کے حواس کو متاثر نہیں کرتا تھا۔

مفتی صاحب کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا جس میں مذہب، رنگ، نسل یا عمر، طبقے اور علاقے کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ صحیح معنی میں پیکر مروت تھے۔ آج کل مسلمانوں نے مسلک کے فروعی اختلافات کو مخالفت کا شاخسانہ بنا رکھا ہے۔ مفتی صاحب اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے مسلک کا احترام کرتے۔ اور فروعی اختلاف کو بنیادی اصولوں پر اختلاف کو بنیادی اصولوں پر غالب نہ آنے دیتے۔ اکثر احباب واقف ہیں کہ مفتی صاحب اور صاحب زادہ محمد محسن فاروقی سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ کلیم اللہ دہلویؒ کے الگ الگ مسلک تھے۔ اور بعض امور میں شدید اختلاف تھا۔ مگر دونوں میں پُرخلوص تعلقات تھے۔ فاروقی صاحب ہمیشہ مفتی صاحب کو عرس کی تقریبات کا دعوت نامہ بھیجتے اور مفتی صاحب اس میں شرکت فرماتے۔ اور خاص طور پر مغرب اور عشا کی نماز پڑھاتے۔ نماز کے بعد قوالی ہوتی۔ ایک موقع پر فاروقی صاحب نے مفتی صاحب سے نہ جانے کیا سرگوشی کی کہ وہ محفلِ قوالی میں شریک ہو گئے قوال نے اپنے سازوں کی مخصوص مگر شدید دھنوں میں قول کا آغاز کیا۔ مفتی صاحب نے پھر اُٹھنا چاہا مگر فاروقی صاحب نے روک دیا۔ قوال نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزامیر کے ساتھ قول شروع کیا۔

جو لوگ قوالی کے آداب سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عموماً تمام صوفیا اور خصوصاً سلسلۂ چشتیہ کے صوفیا اور ارادت مند قول پر بڑھ چڑھ کر نذر پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے پیر یا کسی بزرگ کے بزرگ کے توسل سے حضرت علیؑ کے حضور نذر پیش کرنے میں اپنی شدید عقیدت کا اظہار کرنے اور خلوصِ نیت سے کام لیتے ہیں۔ قوالی کے آداب کے مطابق نذر کسی کو پیش کی جائے لیکن آخر میں وہ سجادہ نشین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ نذر کا سلسلہ چلا تو آخر میں اُس کی تان فاروقی صاحب پر ٹوٹتی۔ لیکن فاروقی صاحب اس نذر کو مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اس صورت حال میں مفتی صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ مگر کمال متانت سے بیٹھے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد فاروقی صاحب سے اجازت لے کر محفلِ قوالی سے اُٹھ گئے۔ چند

دن کے بعد میں مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچا تو وہ کمال خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ایک ذاتی معاملے کے بارے میں استفسار کروں؟ مسکراتے ہوئے فرمایا پوچھیے۔ میں نے عرس حضرت شیخ کلیم اللہ کی محفل قوالی اور نذر کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سوال کیا۔ حضرت آپ کے مسلک میں قوالی مزامیر کے ساتھ جائز نہیں۔ پھر آپ نے اس محفلِ سماع میں کیوں شرکت فرمائی اور نذر قبول کی؟ یہ خالص صوفیوں کا طریقہ ہے۔ بہت متانت سے فرمایا۔

"میاں عنوان! میرا مسلک وہی ہے، جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے؟ یعنی میں مزامیر کے ساتھ قوالی کو جائز نہیں سمجھتا۔ سماع کے آداب بہت سخت ہیں۔ اکثر لوگ ان کی پابندی نہیں کرتے۔ اس محفلِ سماع میں میری شرکت اختیاری نہیں بلکہ یہ مجبوری تھی۔ اس وقت میرے سامنے دو راستے تھے۔ جن میں سے ایک کو مجھے اختیار کرنا تھا۔ ایک یہ کہ میں محفلِ سماع میں بیٹھوں اور اپنی طبیعت پر جبر کر کے نیز اپنے مسلک کے خلاف سماع سنوں۔ دوسرا یہ کہ میں فاروقی صاحب کی دل شکنی کر کے اپنے مسلک کی حفاظت کی خاطر محفلِ سماع سے اٹھ جاؤں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ فاروقی صاحب کی دل شکنی سے بہتر اپنی طبیعت پر جبر کرنا ہے رہا میرے مسلک کا معاملہ تو اس محفلِ سماع میں شرکت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انھوں نے نہایت سنجیدہ انداز میں فرمایا" میری نگاہ میں دل شکنی کرنا سماع سننے سے کہیں زیادہ بڑا گناہ ہے۔ پھر مروت بھی تو کوئی چیز ہے"۔ میں اس جواب کو سن کر دنگ رہ گیا۔ میرے دل نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ تم نے لغت میں مروّت، اور صلحِ کل کے معنی پڑھے تھے۔ آج ان معانی کا عمل دیکھ لیا۔ سچ ہے لفظ کے ایک معنی ہوتے ہیں اور دوسرا اس کا عمل۔ دراصل وہی لفظ زندگی ہے جو پہلے اپنے معانی کا انکشاف کرتا ہے اور پھر انسان کی زندگی میں عمل بن کر داخل ہو جاتا ہے مفتی صاحب صحیح معنی میں "معنیٔ لفظِ آدمیت تو تھے ہی" وہ پیکرِ معنیٔ آدمیت بھی تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مفتی صاحب، دوسرے بہت سے علماء اور دانش وروں کی طرح فکر و عمل اور دین و دنیا کو الگ الگ تصور نہیں کرتے۔ انھیں دینی بصیرت کے ساتھ سیاسی شعور بھی حاصل تھا۔ ان کی دینی

بصیرت ان کے سیاسی شعور کی رہنمائی کرتی اور ان کا سیاسی یا دنیاوی شعور ان کی مذہبی بصیرت کو مہمیز کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے دوسرے بہت سے علماء کی طرح سیاست کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھا یوں تو ان کا جھکاؤ کانگریس کی طرف تھا مگر وہ دوسری سیاسی جماعتوں کو بھی لائق اعتنا سمجھتے۔ میں ان کے یہاں اکثر جاتا، وہاں مختلف موضوعوں پر مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی۔ یاد ش بخیر ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک سیاست کے قومی اسٹیج پر جنتا پارٹی اور کانگریس میں جو آنکھ مچولی ہوتی رہی، اس سے سب لوگ باخبر ہیں۔ اس پس منظر میں صرف یہ کہنا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں کانگریس کے برسراقتدار آنے کے بعد ایک دن میں نے مفتی صاحب سے سوال کیا۔ حضرت! ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ نے جنتا سرکار اور کانگریس حکومت میں کیا فرق محسوس کیا۔ انھوں نے برجستہ فرمایا میں تفصیلات اور جزئیات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کانگریس کی حکومت میں اگر میں کسی وزارت یا محکمہ میں جاتا تو میرے چہرے کی ریش کے باوجود افسران تہذیب سے پیش آتے اور بیٹھنے کے لیے کہتے۔ لیکن جنتا سرکار میں افسران کا تہذیب و شرافت سے پیش آنا تو درکنار کوئی بیٹھنے کو بھی نہ کہتا۔ انھوں نے بےحد سنجیدہ ہوتے ہوئے فرمایا۔ جنتا سرکار میں ڈاڑھی کی اتنی بھی وقعت نہ تھی، جتنی کانگریس سرکار میں تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مفتی صاحب نے ایک واقعہ کے حوالے سے دونوں پارٹیوں کے رویوں کی نشان دہی کر دی ہے۔ مفتی صاحب معمولی باتوں اور واقعات سے غیر معمولی کام لینے اور سادگی کے ساتھ بلیغ باتیں کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ یہی وہ ذہانت اور فطانت ہے، جس نے مفتی صاحب کو ان کے معاصرین میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

یہ راز مفتی صاحب کی نگاہِ جوہر شناس پر آشکار تھا کہ اسلام کوئی جامد یا میکانکی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مادی اور روحانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور اس میں ایسے رہنما اصول اور اشارے موجود ہیں جو ابد تک بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ان کی نگاہ میں اللہ کی زمین اللہ کے احکام، انسانیت اور فطرت کے اصولوں کی روشنی میں زندگی گزارنے کا نام اسلام تھا اس لیے انھوں نے دنیا اور سیاست سے راہبانہ تعلق بے تعلق نہیں رکھا۔ بلکہ انھوں نے خیر و شر کی رزم گاہ میں تماشائی سے زیادہ فریق کا رویہ اختیار کیا۔ ان کا بچپن اور عنفوانِ شباب دارالعلوم دیوبند کی علمی اور انقلابی فضا میں گزرا تھا۔ اس لیے دینی علوم کے ساتھ قومی اور ملی سیاست بھی

ان کی شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔ انھوں نے اپنے عنفوانِ شباب میں تحریکِ خلافت کی آواز پر لبیک کہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جس وقت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی وفات کی خبر دیوبند پہنچی، اس وقت مفتی صاحب تحریکِ آزادی کے ایک جلسہ کو خطاب کر رہے تھے۔ تحریکِ خلافت سے ان کی وابستگی ایک طرف قومی سیاست سے ان کا ذہنی رشتہ جوڑتی ہے اور دوسری طرف ملی مسائل اور اسلامی ممالک کی سیاست سے گہری دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد قومی زندگی کا عجیب عالم تھا۔ زندگی کے افق پر سینکڑوں رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ملک آزاد ہوگیا تھا۔ ذہنیت غلام تھی کچھ ہمارے تساہل اور کچھ خود غرضی نے ملکی سیاست کو بازیچۂ اطفال بنادیا تھا۔ خوشحالی کے خواب کو افلاس نے جھٹلادیا تھا۔ تعصب اور فرقہ پرستی نے قومی ایکتا کی ردا تار تار کر دی تھی۔ تاریکی روشنی کو ڈس رہی تھی۔ جہل علم کو نگل رہا تھا۔ چاروں طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ انسانیت سربگریباں تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد خون کا دریا پار کر کے سرحد پار جاچکی تھی۔ پاکستان سے مظلوم ہندو آگئے پریشاد ے کر ہمارے یہاں "شرنارتھی" بن چکے تھے۔ ایسی صورت حال میں ہندوستانیت اور انسانیت، تہذیب اور شرافت سینکڑوں خنجروں کی زد پر پڑی ہوئی تڑپ رہی تھی اس عالم میں کسی مفکر اور دانشور کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے قومی اور ملی مسائل کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا۔ وہ اس نکتہ سے آگاہ تھے کہ اگر انسانیت کا وجود خطرے میں ہو تو ایک کرمِ کتابی کی نہیں مردِ انقلابی کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ انھوں نے اپنے علم کا رشتہ عمل سے ملالیا۔ ان کا علم ان کے عمل کو اور ان کا عمل ان کے علم کو جلا کرتا رہا۔ اگرچہ مفتی صاحب اوائل عمری ہی سے تحریکِ خلافت اور اس کے بعد جمیعۃ العلمائے ہند سے وابستہ رہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اُن کا سیاسی تدبر زیادہ بروئے کار آیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تو کہا جاتا تھا کہ مولانا حفظ الرحمان جمیعۃ العلماء کے "بازوئے شمشیر زن" مولانا محمد میاں "لوح و قلم" اور مفتی صاحب "دماغ" ہیں۔ اگرچہ مولانا حفظ الرحمان جمیعۃ العلماء کے اہم ستونوں میں تھے اور مفتی صاحب بظاہر معمولی رکن تھے۔ لیکن ان کی رائے کا احترام کیا جاتا اور ان کا جمیعۃ سے جو تعلق تھا، وہ فعال رشتہ کے ضمن میں آتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمان کی وفات کے بعد جمیعۃ العلماء ایک ایسے دوراہے پر آگئی جہاں

شخصی مفادات، اجتماعی مفادات پر اور جذبات عقل پر چھا گئے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ لیکن وقتی طور پر بعض زعمائے ملت نے یہ راہ نکالی کہ حضرت مولانا فخر الدین کو صدر بنایا گیا اور مفتی صاحب کو ورکنگ صدر کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ مگر انسانی نفسیات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ منافقوں کے ہجوم میں مفتی صاحب کے شیشۂ دل میں بال آچکا تھا۔ کب تک برداشت کرتے۔ اُن کے سامنے دو راستے تھے۔ جمیعۃ کے اندر رہ کر جنگ کرنے کا۔ جس سے جمیعۃ العلماء کمزور ہوتی۔ یا باہر نکل کر اپنی راہ الگ بنانے کا جس میں اپنا ذاتی وجود خطرے میں پڑتا۔ اس دوراہے پر انھوں نے تاریخی فیصلہ کیا۔ انھوں نے اجتماعیت کو کمزور کرنے کے بجائے اپنے وجود کو خطرے میں ڈالنا پسند کیا اور جمیعۃ العلماء کو چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ یہ واقعہ ان کی شخصیت کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ انھیں جمیعۃ کو الوداع کہنے میں جو ذہنی کرب اور صدمہ پہنچا، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جنھیں "ذہنی ہجرت" کے تجربوں کے صدموں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

جمیعۃ العلماء ہند سے الگ ہونے کے بعد، مفتی صاحب نے ایک ایسی جماعت کا منصوبہ بنایا، جو زیادہ وسیع بنیادوں پر قائم ہو۔ انھوں نے مسلمانوں کے مختلف مسالک کے علماء سے ربط قائم کیا مختلف سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کی مسلمانوں کی متعدد تنظیموں اور اداروں سے رشتہ قائم کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں یہ خواب مجلس کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا مجلس مشاورت ایک ایسے فورم کی شکل میں نمودار ہوئی۔ جہاں مسلمان اپنے مذہبی اعتقادات اور سیاسی نظریوں سے اوپر اٹھ کر مسلمانوں کے اہم اجتماعی معاملات اور مسائل حل کرنے میں ایک دوسرے سے اشتراک عمل کرتے۔ ابتدا میں ڈاکٹر سید محمود اس کے صدر اور مفتی صاحب نائب صدر مقرر ہوئے۔ چنانچہ مجلس مشاورت نے مسلمانوں کے دینی تعلیمی، معاشی اور اجتماعی مسائل کا تجزیہ کیا۔ اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جدید ہندوستان میں مجلس مشاورت نے مسلمانوں کے مسائل کو کس حد تک حل کیا، اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ ڈاکٹر سید محمود کی وفات کے بعد مجلس مشاورت کا قرعۂ فال مفتی صاحب کے نام نکلا۔ اس بات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس دور میں مفتی صاحب کی شخصیت ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی جس پر مسلمانوں کے اکثر فرقے اور سیاسی جماعتیں نیز ادارے اور تنظیمیں متفق تھیں انھیں سرکار کے علاوہ غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں کا اعتماد بھی حاصل تھا۔ یہ ایسی خصوصیت ہے، جو ان کی شخصیت کو ہندستان

میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ مفتی صاحب مختلف عناصر کو یک جا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ مختلف المزاج افراد، اداروں اور جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کا فن جانتے تھے۔ مگر اس کا وہی حشر ہوا جو مسلمانوں کی عام جماعتوں اور تنظیموں کا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب اندھوں کی نگری میں کب تک آئینے بیچتے۔ خود مجلس کے عناصر کی منافقتوں اور رقابتوں نے اس تنظیم کو کمزور کر دیا۔ مفتی صاحب، اس بات سے مغموم تھے، مگر مایوس نہ تھے۔ انھیں اُمید تھی کہ لوگ ذاتی اختلافات، جماعتی مفادات اور فروعی خرافات سے بلند ہو کر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں ایک دوسرے سے اشتراک و تعاون کریں گے۔ ان کی شخصیت کا یہ رجائی پہلو بےحد اہم ہے دراصل ان کی شخصیت ایک ایسی توس و قزح تھی، جس پر علم و عمل، ذہانت و بصیرت، تدبر اور روشن خیالی کے رنگ رقص کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اسلامی اور قومی تہذیب کی روشن علامت تھی۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، مفتی صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اُس دور میں مسلمان دانش وروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ ہندوستان کے بدلے ہوئے نقشہ پر مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو۔ یہ مسئلہ آسان نہ تھا۔ مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو کا مسئلہ تھا۔ اس سوال کے ساتھ دوسرے بہت سے ضمنی اور ذیلی سوالات بھی وابستہ تھے۔ یعنی یہ کہ بدلے ہوئے حالات میں خود مسلمانوں کا کیا رویہ ہو؟ برادرانِ وطن کے دل سے کس طرح شک و شبہ کی گرد دور ہو۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے سوالات سامنے تھے۔ اِس مرحلہ پر مفتی صاحب نے ایک بار پھر اپنے تدبر کا ثبوت دیا۔ انھوں نے برادرانِ وطن کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور مسلمانوں میں حوصلہ اور بیداری پیدا کرنے کے لیے اپنے رفقاء کے ساتھ ملک گیر دورے کا پروگرام مرتب کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبد الجلیل، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ابراہیم سلیمان سیٹھ، مولوی محمد اسماعیل، مولانا منظور النبی اور پنڈت سندرلال کے ہمراہ لگ بھگ ۴۲ ہزار میل کا سفر کیا۔ ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر ملک کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو خاص طور پر، اور برادرانِ وطن کو عام طور پر ان کے فرائض یاد دلائے قومی اتحاد، بقائے باہم اور مل جل کر رہنے پر زور دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ذہنی انتشار سے نکال کر جینے کا حوصلہ بخشا۔ برادرانِ وطن کے دلوں سے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی۔

اور تمام ہندوستانیوں کو ایک ذہنی رویے ایک نئے فکر تعمیری نظریہ حیات اور نئی روشِ حیات کی طرف مائل کیا۔ جو لوگ سیاست کے اتار چڑھاؤ پر گہری نظر رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک کا زمانہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر پرآشوب تھا۔ مفتی صاحب نے اِس بحرانی دور میں اپنی خوش بیانی، سحرِ خطابت اور تدبر سے دلوں کو جوڑنے کا کام انجام دیا۔ سچ یہ ہے کہ ؎ جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتحِ زمانہ۔

مفتی صاحب کو سماجی اور تہذیبی کاموں سے جو لگاؤ تھا، اس کو واضح کرنا اور اُس کے اثرات و نتائج کی نشاندہی کرنا، ان کے سوانح نگار کا کام ہے، یوں بھی چاول پر قل ہو اللہ احد لکھنا آسان کام نہیں۔ لیکن ان کے تعلیمی تہذیبی اور سماجی خدمات کا ہلکا سا خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مفتی صاحب کی شخصیت کا سماجی پہلو بھی سامنے آجائے۔ انھوں نے اینگلو عربک اِسکول کی مینیجنگ کمیٹی کے صدر، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن، جامعہ ملیہ اسلامیہ کورٹ کے رکن کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فعّال رشتہ قائم رکھا بلکہ جدید تعلیمی نظریات کے فروغ میں خاموش خدمات انجام دیں۔ یہ تعلق ایک طرف مفتی صاحب کی روشن خیالی اور وسیع النظری کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف اُن علمار کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے، جو اب بھی جدید تعلیم کو کلّی طور پر مضر اور مہلک خیال کرتے ہیں۔ اِن اداروں سے مفتی صاحب کا تعلق رسمی نہیں تھا بلکہ وہ اداروں کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ رہتے تھے۔ اور صحیح معنی میں اِنھیں انسانوں کی تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے دراصل ان کا یہ طرزِ عمل اس حدیث شریف کے مطابق تھا، جس میں رسول اکرم ؐ نے فرمایا ہے کہ "حکمت، مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے، اِسے جہاں سے ملے، حاصل کرلو یا۔ علم حاصل کرنا مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ مفتی صاحب نے جدید تعلیم کا فراخ دلی سے خیر مقدم کیا ہے۔ جہاں تک مذہبی اور دینی تعلیم کا تعلق ہے۔ اِس میدان میں ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ انھوں نے مدرسۂ عبدالرب کے صدر، مسلم کلچرل اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ موخرالذکر سوسائٹی کے تحت ایک نسوانی اسکول بنام مدرسۃ البنات دہلی میں بہت اہم خدمات انجام دے رہا ہے اس کے علاوہ مفتی صاحب ہندوستان کے عظیم دینی تعلیم کے اداروں کے سرگرم اور فعال کارکن کی حیثیت سے اس میدان میں

ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اسلامک انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کے رکن، ندوۃ العلماٗ اعظم گڈھ کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے ایک طرف ان اداروں کے انتظامی معاملات کو مفید اور معتدل بنانے کی کوشش کی اور دوسری طرف دینی تعلیم کے فروغ میں حصہ لیا۔ مفتی صاحب ایک خالص مذہبی عالم ہونے کے ساتھ، مخصوص جدید تعلیمی حیثیت سے بہرہ مند بھی تھے۔ یہی وصف ان کو دورِ جدید کے اعلیٰ ممتاز عالموں اور مفکروں میں شامل کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب کے تعلیمی نظریہ کے وسیع کینوس پر دینی اور دنیاوی ہر قسم کی تعلیم کے رنگ کھلتے اور کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مفتی صاحب نے اگرچہ خالص سیاسی عہدوں کو قبول نہیں کیا۔ مگر وہ اس سے یکسر بے نیاز بھی نہیں رہے۔ انھوں نے ایسے سرکاری اور نیم سرکاری عہدوں کو ضرور قبول کیا، جن کے ذریعہ خاص طور پر مسلمانوں کی اور عام طور پر تمام اہلِ وطن کی خدمت انجام دی جا سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلامی شعائر اور مسلمانوں کے مسائل کو پیشِ نگاہ رکھا۔ ارکانِ اسلام میں حج کو جو فضیلت حاصل ہے، اس سے ایک عام مسلمان بھی واقف ہے۔ حضورِ اکرم ؐ کا ارشاد ہے کہ حجِ مبرور کے بعد انسان اتنا پاک اور صاف ہوتا ہے، جتنا پیدائش کے فوراً بعد ایک بچہ۔ اس لیے مفتی صاحب نے سنٹرل حج کمیٹی کی تین بار صدارت قبول کر کے مسلمانوں کو فریضۂ حج کی ادائیگی میں خاموش خدمات انجام دیں۔ ہندوستان میں مسلم اوقاف کا معاملہ پہلے بھی پیچیدہ تھا اور اب بھی پیچیدہ ہے۔ اوقاف کے مسائل حل کرنے کے لیے دینی شعور کے ساتھ جس نیک نیتی، تدبر اور دردمندی کی ضرورت ہے، وہ مفتی صاحب کی شخصیت میں موجود تھی۔ مفتی صاحب نے دہلی وقف بورڈ کے صدر اور اس کی مالیاتی کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں ان کے بعض فیصلوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی، اور بعض حلقوں سے سنگِ ملامت بھی برسائے گئے، لیکن ان کے بے رحم نقاد بھی، مفتی صاحب کے حسنِ تدبر کے قائل رہے۔ مفتی صاحب سنٹرل وقف کاؤنسل کے رکن بھی رہے۔ انھوں نے جناب حافظ محمد ابراہیم مرحوم کے دورِ وزارت اور سید اطہر حسین صاحب کے دورِ نظامت (سیکریٹری شپ) میں وقف ایکٹ بنوا کر اوقاف کے معاملات کو صحیح سمت و جہت عطا کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں یہ بات لوگوں کے ذہن سے محو ہوتی جاری ہے

کہ مسجد عبدالنبی کے سلسلہ میں سرکار نے جو کمیٹی تشکیل دی تھی، اس کے صدر مفتی صاحب تھے۔ مفتی صاحب اور ان کی کمیٹی کی جدوجہد سے ہی مسجد عبدالنبی محکمہ آثار قدیمہ سے واگذار ہوئی تھی۔ اسی مسجد میں آج کل جمعیۃ العلماء ہند کا صدر دفتر ہے۔

اگرچہ مفتی صاحب نے اپنا مذہبی سفر علمی اور عملی نیز تحریری اور تقریری دونوں سطحوں پر شروع کیا تھا، لیکن حالات کے تغیر کے ساتھ، ان کی تقریر غالب ہوتی گئی اور ان کے تصنیفی پہلو پر ان کا عملی پہلو حاوی ہوتا گیا۔ مفتی صاحب نے اپنا علمی سفر "فتویٰ نویسی" سے شروع کیا تھا۔ یہ کام دیوبند کے بعد ڈابھیل میں بھی جاری رہا۔ اس کے بعد فتویٰ نویسی کے کام میں تسلسل نہیں رہا۔ لیکن وہ ضرورت مندوں کے سوالوں کے شرعی اور فقہی جوابات لکھتے رہے۔ اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے جتنے استفسارات پر فتوے صادر فرمائے ہیں، اگر ان کو "فتاوائے عتیقی" کے نام سے مرتب کرلیا جاتا تو ایک اچھا خاصا علمی اور دینی ذخیرہ مہیا ہوجاتا۔ ان فتووں کے ذریعہ مفتی صاحب کی دینی فہم اور اجتہادی بصیرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۲ء تک ڈابھیل میں "بیضاوی شریف" اور "جلالین شریف" کا جو درس دیا اور اس سلسلے میں جو علمی نکات بیان فرمائے، اگر انھیں کو مرتب کرلیا جاتا تو ایک بڑا کام ہوجاتا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک مفتی صاحب نے کلکتہ میں قرآن کریم کے درس کا جو حکیمانہ سلسلہ شروع کیا تھا، اگر اس کا ریکارڈ ہوتا تو ایک ایسی تفسیر ہاتھ آجاتی، جو جدید ذہن کو متاثر کرتی۔ ۱۹۳۸ء میں "ندوۃ المصنفین" کے قیام کے بعد مفتی صاحب نے دو اہم علمی کارنامے انجام دیے انھوں نے علامہ ابن تیمیہ کی کتاب "الکلم الطیب" اور علامہ ابن جوزی کی کتاب "صید الخاطر" کا ترجمہ کرکے اردو کے علمی اور دینی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ترجمہ کا فن کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں، جو اس فن کی اہمیت اور دقتوں سے عملی طور پر واقف ہیں۔ لیکن ملکی اور ملی مسائل کی عقدہ کشائی نیز ندوۃ المصنفین کی انتظامی ذمہ داریوں نے انھیں اس کام کو آگے بڑھانے کی مہلت نہ دی۔ اس کے باوجود مفتی صاحب وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ان کے بعض مقالات شائع ہوچکے ہیں، ممکن ہے بعض مقالات غیر مطبوعہ بھی ہوں۔ مفتی صاحب نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ریڈیو کی درخواست پر دینی، مذہبی اور علمی مسائل اور اشخاص پر بہت سی ریڈیو تقریریں نشر کیں انھوں نے نثری تقریروں کا ایک ایسا انبار لگادیا، جس سے آئندہ نسلیں خوشہ چینی کرتی رہیں گی یہیں نے

مفتی صاحب کی چند تقریروں کو جمع کر کے ۱۹۸۰ء میں "منارِ صدا" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ یہ تقریریں ایک طرف مفتی صاحب کے علمی و دینی شعور کی آئینہ دار ہیں، اور دوسری طرف ان کے اسلوب تحریر کا بہترین نمونہ ہیں۔ میں نے "پیش رس" میں لکھا تھا۔

"ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو ریڈیو تقریر کے فنی اور تکنیکی تقاضوں کا بھرپور ادراک ہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی نے قدم قدم پر اس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب میں فراہم کیا ہے۔ ریڈیو تقریر کا فن چاول پر قل ہو اللہ " لکھنے یا ساگر کو گاگر میں بند کرنے کا فن ہے۔ ریڈیو تقریر میں موضوع کے تعین کے ساتھ وقت کی حدود کا تعین بھی ہوتا ہے۔ یعنی کم سے کم وقت میں جامع مگر واضح انداز میں بات کی جاتی ہے۔ ریڈیو تقریر متعین موضوع پر معین وقت میں پڑھی جانے والی ایک ایسی تحریر ہے، جو بیک وقت تحریر اور تقریر دونوں کی خصوصیات کی حامل ہو اور جس مقصد کے لیے لکھی گئی ہو، پوری طرح اس کا حصول کرتی ہو۔"

مفتی صاحب نے ان نشری تقریروں میں ایک طرف نشری تقاضوں اور دوسری طرف علمی و دینی مطالبوں کو پورا کیا ہے انھوں نے اسلامی عقائد، افکار، ارکان، تہذیب و ثقافت نیز اسلامی شخصیات پر جو نشری تقریریں سپردِ قلم کی ہیں، وہ بہترین سرمایہ ہے۔ ان کے اسلوب میں پختگی، سادگی اور روانی کے ساتھ، جو عالمانہ وقار ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلوب پر شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے، تو بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کی نشری تقریروں اور ان کی تحریروں پر ان کی شخصیت کا نقش مرتسم ہے۔

مفتی صاحب کا وطن قصبہ دیوبند ہے جو دنیا کے نقشہ پر دینی تعلیم کا ایک روشن نشان ہے۔ اور کئی علمی اور دینی خانوادوں کا گہوارہ ہے۔ انھیں خانوادوں میں سے ایک خانوادہ عثمانی خاندان بھی ہے۔ جو اپنی علمی و دینی فضیلت اور شرافت کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مفتی صاحب کا تعلق اسی عثمانی خاندان سے ہے۔ ان کے دادا حضرت مولانا فضل الرحمان عثمانیؒ ایک جلیل القدر عالم اور روشن دل صوفی بزرگ تھے۔ مرحوم کا شمار ان چند بزرگوں میں ہوتا ہے۔ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی کہلاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے پدر بزرگوار حضرت مولانا عزیز الرحمان عثمانی بھی اپنی

جگہ جید عالم اور شیخ طریقت تھے ۔ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی انھیں کشفِ قبور کے علم میں مہارت حاصل تھی ۔ مرحوم دار العلوم دیوبند میں مفتی اعظم کے منصب پر فائز تھے ۔ اور اخلاقِ کریمانہ کا پیکر تھے ۔ اِسی گھرانے میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک چراغ روشن ہوا جس کا نام عتیق الرحمان رکھا گیا ۔ خاندان کے دستور کے مطابق عتیق الرحمان عثمانی نے دینی تعلیم حاصل کی ۔ ان کا ذہنی نشوونما دیوبند کی علم پرور فضا میں ہوا ۔ اور یہیں سے انھیں سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت حاصل ہوئی ۔ انھوں نے طالب علمی کے دوران اپنے اساتذہ کو اپنی لیاقت ، ذہانت اور محنت سے متاثر کر لیا تھا ۔ اس لیے وہیں معین المدرس کے عہدہ پر مامور ہو گئے ۔ اس دوران انھوں نے درس وتدریس کے ساتھ نائب مفتی کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں ۔ اور دنیا کے دینی نقشہ پر مفتی عتیق الرحمان عثمانی کے نام نامی سے جانے پہچانے گئے ۔ مفتی صاحب نے فتویٰ نویسی کی تربیت اپنے والدِ محترم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانیؒ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند کے زیرِ سایہ حاصل کی تھی اور اس فن پر وہ عبور حاصل کیا کہ ان کا لوہا بڑے بڑے علماء نے مانا ۔

مفتی صاحب ایک فعّال اور انقلابی ذہن کے مالک تھے ۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں جمعیۃ الطلباء قائم کی ۔ اور "مہاجر" اخبار نکالا جس کے ایڈیٹر حضرت مولانا عبد الوحید صدیقی غازی پوری مقرر ہوئے ۔ مفتی صاحب نے جمعیۃ اور مہاجر کے ذریعہ اپنے فکروعمل کا مظاہرہ کیا ۔ مفتی صاحب کے ان اقدام کی اہمیت کا اندازہ اس پس منظر میں ہو سکتا ہے کہ اس دور میں مفتی صاحب کے والدِ محترم دیوبند کے مفتی اعظم اور عمِ محترم حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی مہتمم تھے ۔ مفتی صاحب نے دار العلوم کے انتظام اور مطبخ کے اہتمام نیز دیگر امور میں اپنے بزرگوں اور اربابِ حل و عقد سے اختلاف کیا ۔ یہ ایک نوجوان عالم کی ضد نہیں تھی ۔ بلکہ ایک اصول پسند ، حق گو اور راست باز اِنسان کا اخلاقی اقدام تھا ۔

مفتی صاحب کے معین المدرس مقرر ہونے کے بعد ، دیوبند کے اکابر کے مابین اختلافات گہرے ہو گئے ۔ اختلافِ رائے اور مخالفت بے جا میں جو نازک فرق ہے ، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو نتیجہ بہت بُرا نکلتا ہے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اس شکر رنجی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس وقت کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ کو دار العلوم دیوبند کو خیرباد کہنا پڑا ۔ ان علماء اور دانش وروں کے ساتھ

مولانا بدرِ عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمان اور مفتی عتیق الرحمان عثمانی بھی باہر نکل آئے۔ اس قافلے نے ڈابھیل (گجرات) کو اپنا مستقر بنایا۔ یہاں "تعلیم الدین" کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا۔ یہ قافلہ اس مدرسہ سے اس طرح وابستہ ہوا کہ اس کا نام جامعۂ اسلامیہ ہو گیا۔ مفتی صاحب اس مدرسہ میں مدرس اور مفتی کے فرائض انجام دیئے تھے۔ کچھ دن بعد مفتی صاحب کلکتے چلے گئے اور کولوٹولہ اسٹریٹ کی مسجد میں خطیب اور مفتی کی حیثیت سے دینی خدمات انجام دینے لگے۔

مفتی صاحب کی زندگی میں پہلا اہم موڑ دارالعلوم دیوبند کو خیر باد کہنا تھا۔ دوسرا اہم موڑ کلکتہ سے دہلی کی مراجعت ہے۔ مفتی صاحب نے ۱۹۳۸ء میں مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے مشورہ سے دہلی میں ایک دینی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا اور اس کا نام ندوۃ المصنفین رکھا۔ مولانا حفظ الرحمان اس ادارے کے مشیر و مربی، مفتی صاحب ناظم اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس ادارے کے مجلہ "برہان" کے مدیر قرار پائے۔ ۱۹۳۸ء میں اس ادارہ کا دفتر قرول باغ (دہلی) میں تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ ندوۃ المصنفین کا دفتر بھی نذرِ آتش ہو گیا۔ اس تباہی کے بعد مفتی صاحب اس ادارہ کو جامع مسجد کے علاقے میں لے آئے اس ادارے نے کئی سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر شائع کر کے ذہن انسانی کو سیراب کیا ہے۔ اور برہان کے دینی اور علمی مقالوں نے زبردست علمی شعور بیدار کیا ہے یہ مفتی صاحب ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر آئندہ نسلیں فخر کریں گی۔

مفتی صاحب کی زندگی کے آخری چند برس بہت اذیت میں گزرے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے ایک دیوبند کا قضیۂ نامرضیہ بھی ہے۔ جس نے مفتی صاحب کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس قضیے میں ایک طرف حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے صاحبزادے مولوی اسعد مدنی اور ان کے ہم نوا تھے۔ دوسری طرف مولانا قاری محمد طیبؒ کے صاحبزادے مولوی محمد سالم صاحب تھے۔ دونوں طرف سے دارالعلوم دیوبند پر تسلط جمانے کے لیے جو کچھ ہوا، چشم فلک نے ایسے تماشے کم دیکھے ہوں گے۔ اس مسئلہ پر مفتی صاحب کا عجیب عالم تھا۔ میں جب بھی اس ذکر کو چھیڑتا ان کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں۔

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

مفتی صاحب کی یہ کیفیت دیکھ کر میں اپنے سوالوں کو لب اظہار تک نہ آنے دیتا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر پر مفتی صاحب نے ایک دن اتنا کہا کہ دونوں حلقے جزوی طور پر حق پر اور جزوی طور پر ناحق پر ہیں۔ انھوں نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرماتے ہوئے کہا کہ اگر ایک طرف مولوی اسعد مدنی اور دوسری طرف مولوی محمد سالم بہ رضا و رغبت دارالعلوم سے الگ ہو جائیں تو یہ معاملہ بہ آسانی ختم ہو سکتا ہے لیکن نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ برسات کی ایک سیاہ رات میں نوجوان مولویوں کے ایک ہراول دستے نے دارالعلوم پر سیاسی نوعیت کا وہ شب خوں مارا کہ علم و دانش اور تہذیب و شرافت کا سر نگوں ہو گیا۔ علماء کی اس محاذ آرائی نے مفتی صاحب کو اندر ہی اندر کاٹ دیا تھا۔ اُن کا احساس خون ہو چکا تھا۔ موت اور زندگی خدا کی طرف سے ہے۔ لیکن حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مفتی صاحب کی وفات حسرت آیات کا ایک سبب دارالعلوم دیوبند پر نوجوان مولویوں کے ہراول دستہ کا شب خون بھی ہے جس کو بعض معتبر علماء کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔

کچھ عمر کے تقاضوں اور کچھ حالات کی ستم ظریفی نے مفتی صاحب کے اعصاب کو کمزور کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ملت کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔ غالباً فروری ۱۹۸۲ء میں ندوۃ العلماء اعظم گڈھ نے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کیا۔ مفتی صاحب اس سیمینار میں شرکت کے بعد واپس دہلی آرہے تھے۔ اچانک ریل میں دریاآباد کے قریب ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور وہ خانہ نشین ہو کر رہ گئے۔ اس کیفیت میں بھی علم، دین اور وطن سے ان کا رشتہ کمزور نہیں ہوا۔ مفتی صاحب مضبوط ارادوں کے انسان تھے۔ لیکن آخری دنوں میں بہت رقیق القلب ہو گئے تھے۔ میں نے انھیں پہاڑ کی طرح اٹل دیکھا تھا لیکن آخری دنوں میں شمع کی طرح پگھلتے بھی دیکھا۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ واقعہ یہ ہے کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۵ء کو بعد نماز ظہر مفتی صاحب کا وصال ہو گیا۔ ۱۳ مئی ۸۵ء کو شاہی امام حضرت مولانا سید عبداللہ بخاری نے نماز جنازہ ادا کی۔ جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ کہتے ہیں کہ جس شخص کی نمازِ جنازہ میں ۴۰ افراد سے زیادہ شریک ہوں تو اس پر رحمت کو پیار آجاتا ہے۔ اس اعتبار سے مفتی صاحب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بندوں کے پیارے تو تھے ہی تھے، اللہ کے پیارے بھی

قرار پائے۔ مفتی صاحبؒ کی تدفین قبرستان مہندیان میں ہوئی، جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور دوسرے بہت سے جلیل القدر علما، صوفیا اور دانش ور آسودۂ خواب ہیں۔ اس طرح ایک جاگتی ہوئی شخصیت سوگئی۔ سچ ہے اللہ باقی مِن کُلِّ فانی مفتی صاحبؒ نے اپنے فکر و عمل سے ثابت کردیا کہ

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
کام کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ھو